باب دوم

چند متفرق مباحث

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار واعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے' یعنی شستہ' صاف' سلیس' کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف واصوات کا جامہ پہنا' وہ حروف واصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلامِ الٰہی' قولِ جبرائیل علیہ السلام اور قولِ محمد ﷺ بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حٰمٓ Aوَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ B اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ X﴾

''حٰم۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو''۔

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اوّلاً حروف واصوات کا جامہ پہنا ہے' پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۃ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ A اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ B﴾

''ا ل ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔''

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ μ﴾

''صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔''

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ β﴾

''ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' تاکہ وہ بچ کر چلیں۔''

اس میں کہیں کجی نہیں' کہیں کوئی ایچ پیچ نہیں' اس کی زبان بہت سلیس' شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لئے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں' تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر' لیبیا' الجزائر' موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے' لیکن جو اُن کے ہاں فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہی ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں دوسری کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آ سکتی' اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیئے گئے ہیں۔ ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ

ہماری سمجھ میں آتی ہے۔اس لئے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جارہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی—— لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔حجاز میں بادیہ نشین تھے۔عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔قافلے آرہے ہیں' جارہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد و رفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آجاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے مکّہ کے شرفاء اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔علامہ جلال الدین سیوطی نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو مُعرّب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لئے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ''سِجّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ''سجیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگِ گل'' کا معرب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Divine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے ۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ایک علاقے کی عامی (colloquial) عربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضورﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آرہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔لہٰذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معین کر دیئے ہیں۔ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکیڑ میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔البتہ تدبر قرآن کے لئے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی

ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لئے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اَسماء وصفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء وصفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء وصفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات' اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لئے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے' لیکن میں نے انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لئے وارد ہوئے ہیں' جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ''قرآن مجید'' میں ''مجید'' قرآن کا نام نہیں ہے' درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ''القرآن المجید'' میں اگرچہ ''الف لام'' کے ساتھ ''المجید'' آتا ہے' لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لئے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لئے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ''القرآن'' ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا)۔ اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ''الذکر'' ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لئے سب سے زیادہ جامع نام ''الہدیٰ'' ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ''النور'' ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ''الفرقان'' ہے۔ یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔ قرآن کا ایک نام ''الوحی'' بھی آیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ﴾ (الانبیاء:۴۵)۔ اسی طرح ''کلام اللہ'' کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے' لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں' وہ تو یہی بنتے ہیں۔ اگرچہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جو لفظ بھی قرآن کے لئے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لئے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں' لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِيْمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (الواقعۃ) (۲) اَلْحَكِيْمُ: ﴿يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴾ (یٰسٓ) (۳) اَلْعَظِيْم: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ (الحجر) (۴) مَجِيْدٌ اور اَلْمَجِيْدُ: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (قٓ) (۵) اَلْمُبِيْنُ: ﴿حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾ (الزخرف) (۶) رَحْمَةٌ: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) (۷) عَلِيٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الزخرف) (۸) بَصَائِرُ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الانعام:۱۰۴) (۹،۱۰) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: (حٰمٓ السجدۃ:۴) [اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لئے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لئے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے' نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشْرٰى: ﴿وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل:۸۹،۱۰۲) (۱۲) عَزِيْزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾ (حٰمٓ السجدۃ) (۱۳) بَلَاغٌ: ﴿هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم:۵۲) (۱۴) بَيَانٌ: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۸) (۱۵) مَوْعِظَةٌ (۱۶)

شِفَاءٌ: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) (۱۷) اَحْسَنُ الْقَصَصِ: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ (۱۹) مُتَشَابِه (۲۰) مَثَانِيَ: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ (ص:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيْمِنٌ: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸) (۲۴) قَيِّم: ﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِنْ لَّدُنْهُ﴾ (الکہف:۲) یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لئے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں' اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں' اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں' نذیر بھی ہیں' ہادی بھی ہیں' معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء وصفات ہیں۔

لفظ ''قرآن'' کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ''القرآن'' ہے' جس کے لئے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا' ورنہ تورات کتاب بھی ہے' ہدایت بھی تھی' اور اس کے لئے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی''۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے' رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں' لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتب سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی' اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لئے ہے۔ اسی لئے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علَم ہے' اور اسم جامد ہے' اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ''اللہ'' کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے' اسم علم ہے' اسم جامد ہے' مشتق نہیں ہے' یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ''علیم'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ''العلیم'' نام ہے' رحیم صفت ہے اور ''الرحیم'' نام ہے' اسی طرح الٰہ پر ''ال'' داخل ہوا تو ''الالٰہ'' بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ''اللہ'' بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے' اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ''قرن'' ہے' یعنی قرآن میں جو ''ن'' ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لئے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ''قرن'' مانا ہے' اُن کی بھی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ''قَرَنَ الشَّیءَ بِالشَّیءِ'' (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات' اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا' اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ''قرآن'' بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے' جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں' کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ''۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَأَ' يَقْرَأُ' قَرْأً' وَقِرَاءَةً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔ تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قرأ سے

مصدر قرآن ہے‘ یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔ تو قرآن کا مفہوم ہوگا پڑھی جانے والی شے‘ پڑھی گئی شے۔ ’’قَرَأَ‘‘ میں جمع کرنے کا مفہوم بھی ہے۔ عرب کہتے ہیں: قرأتُ المَاءَ فِی الْحَوْضِ ’’میں نے حوض کے اندر پانی جمع کر لیا‘‘۔ اسی سے قریہ بنا ہے‘ یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔ تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں‘ مل جل کر رہ رہے ہوں۔ تو جمع کرنے کا مفہوم قَرَءَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہرحال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شد و مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے۔ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ :٦٩) ’’ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں‘ نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے‘‘۔ شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾

’’اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔‘‘

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .....﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے‘ اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule)—— چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں‘ کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپؐ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا‘ لہٰذا آپ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔ سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: ’’اَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ‘‘ ’’میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں‘‘۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾. تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کی بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان‘ بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے‘ لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر‘ وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں‘ اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے‘ لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لئے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے‘ جسے آپ ’’آزاد نظم‘‘ (Blank Verse) کہتے ہیں‘ اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک ردھم (Rythm) بھی ہوتا ہے‘ اس میں فواصل بھی ہیں‘ قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے‘ لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں‘ اگرچہ اس کے

وہ معانی نہیں ع ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ پھر ایک کتاب مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ گویا ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآنًا تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لئے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصّوں اور احکام کے لئے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ تو پھر یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعة معلّقة'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Divine Orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیئے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر

خطاب کا رُخ معین ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے‘ مخاطب کون ہے‘ تو اس بات کا اصل مفہوم اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے‘ ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں‘ جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾ (الذّٰریٰت) ’’اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟‘‘ ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ (ابراھیم:۱۰) ’’(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟‘‘ یہ انداز بہرحال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہوگا‘ یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہوگا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا‘ اِدھر جائے گا‘ اُدھر جائے گا‘ لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مجلسِ احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کئے‘ جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے‘ پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی‘ کبھی مغرب کی‘ کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا‘ کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات‘ کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے‘ کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو‘ ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو‘ یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ‘ شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہئے۔ اسی لئے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کئے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اہم مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات‘ اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب‘ جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں‘ مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

پیشکش www.hamditabligh.net از pdf format